اختلافِ مذاہب کی حقیقت

(۲)

مذاہب کے اختلاف کو دیکھ کر کچھ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سب مذہب اپنے اپنے زمانے میں حق تھے اور اس لیے انسان کو ان سب کا یکساں احترام اور یکساں مدح و ثنا کرنی چاہیے، مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آج کار آمد مفید ہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ انھوں نے گزرے ہوئے زمانے میں دُنیا پر مفید اثرات ڈالے ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مذاہب کو بھیجنے والی ہستی ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے اور اُس نے انسانوں کی اصلاح کے لیے اور انھیں زندگی کا صحیح راستہ بتانے کے لیے یہ مذاہب بھیجے ہیں تو پھر ان مذاہب میں بنیادی اور اصولی اختلافات کیوں ہیں؟ جزوی اختلافات کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ حالات کے تغیر، قوموں کے بدلتے ہوئے حالات اور اُن کی جداگانہ نفسیات کی وجہ سے تھے مگر بنیادی اختلافات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مذہب کہتا ہے کہ خدا ایک ہی ہے اور تنہا وہی پرستش و بندگی کا مستحق ہے؛ دوسرا کہتا ہے کہ خدا دو ہیں؛ تیسرا کہتا ہے تین ہیں؛ چوتھا کہتا ہے کہ خدا لاکھوں ہیں اور سب پرستش و بندگی کے مستحق ہیں؛ پانچواں مذہب وحدت الوجود کا قائل ہے اور وہ دُنیا کی ہر شے کو خدا کہتا ہے۔ چھٹا مذہب خدا کا قائل ہی نہیں۔ کیا یہ سب باتیں ایک ہی خدا کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں۔ ایک مذہب صرف ایمان و گیان کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور گیان حاصل ہو جانے کے بعد انسان کو عملی ذمّے داری سے بے نیاز کر دیتا ہے، دوسرا مذہب صرف عمل کو نجات کا باعث قرار دیتا ہے اور تیسرا ایمان و عمل دونوں کو نجات کے لیے ضروری قرار دیتا ہے، کیا یہ متضاد باتیں ایک ہی ہستی کی ہو سکتی ہیں۔ ایک مذہب ترکِ دُنیا اور ترکِ علائق کو مکتی (نجات) کا واحد ذریعہ بتاتا ہے۔ دوسرا مذہب انسانوں میں تفریق کرتا ہے اور بعض کے لیے ترکِ دُنیا اور بعض کے لیے دُنیوی معاملات میں مشغول ہونے کا حکم دیتا ہے۔ تیسرا مذہب ترکِ دُنیا کو غلط سمجھتا ہے، وہ انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے اور اُس کی زندگی کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ دُنیا کی زندگی کو اُس کے تمام متعلقات سمیت اس طرح گزارے کہ اُس سے اُس کا خدا خوش ہو اور خدا کی زمین پر خدا کا قانونِ عدل نافذ ہو۔ کیا یہ تینوں طریقے ایک ہی خدا کے بتائے ہوئے ہیں؟

ایک مذہب کہتا ہے کہ انسان کی رُوح مختلف جسموں اور قالبوں میں بار بار دُنیا میں آتی رہتی ہے، اور جب تک اس کے کرم اچھے نہ ہو جائیں وہ اسی چکّر میں پھنسی رہتی ہے، انسان کی موجودہ زندگی اس کے پچھلے کرموں کا بدلہ ہے اور اس کی نجات یہ ہے کہ اس کی رُوح اس چکّر سے چھوٹ جائے اور خدا کی ہستی میں جا کر مل جائے۔ دوسرا مذہب کہتا ہے کہ دُنیا دارالجزا نہیں، دارالعمل ہے، مرنے کے بعد انسان لوٹ کر اس دُنیا میں نہیں آتا۔ البتہ اس دُنیا کے درہم و برہم ہو جانے کے بعد ایک دوسری دُنیا وجود میں لائی جائے گی جس میں سب انسانوں کو زندہ کیا جائے گا ـــــ جسم و رُوح سمیت ـــــ جس کے بعد وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے کے لیے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انسان کی نجات اس میں ہے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچ جائے اور اُس کے انعام و اکرام کا مستحق ہو۔ تیسرا مذہب کہتا ہے کہ دوسری زندگی ہوگی، لیکن وہ جسمانی ہونے کے بجائے صرف روحانی ہوگی، اور چوتھا کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہی نہیں، کیا یہ چاروں باتیں سچّی ہو سکتی ہیں، اور کیا علیم و خبیر اور صادق القول خدا ایسی متضاد باتیں بھی کہہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سب مذاہب کا یکساں احترام کرنے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنے سے کہ وہ اپنے اپنے زمانے میں برحق تھے ہماری گتھیاں نہیں سلجھتیں۔ اصل غور طلب سوال یہ ہے کہ آج کون سا مذہب برحق ہے اور کس سے موجودہ انسانی امراض کا مداوا ممکن ہے۔ اگر کوئی مذہب ایسا نہیں تو پھر مذہب سے ہاتھ دھو لینا چاہیے، اور اگر اس قسم کا کوئی مذہب موجود ہے تو صرف وہی قابلِ قبول ہے اور باقی مذاہب کا نام لینا فضول اور خارج از بحث ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تمام مذاہب ناقص ہیں اور اسی لیے ان میں اختلاف ہے، جس طرح درخت کا تنہ ایک ہوتا ہے مگر شاخیں اور پتّے بہت سے ہوتے ہیں، اسی طرح سچّا اور مکمل مذہب ایک ہوتا ہے لیکن انسانوں کے اندر آ کر اس کی شکلیں مختلف ہو جاتی ہیں، انسان اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بیان کرتا ہے اور دوسرے انسان جو اس کی طرح ناقص ہیں اس کی شرح کرتے ہیں، ہمارے ناقص ہونے کی وجہ سے مذہب کا جو تصوّر بھی ہمارے ذہن ہوتا ہے وہ ناقص ہی ہوتا ہے۔ سب عقیدوں میں حق کی جھلک ہے، مگر سب ناقص ہیں، اور سب میں خطا کا امکان ہے۔ گویا ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ کہ خود ہمارا عقیدہ نامکمل ہے، کیونکہ اگر ہمیں حق کی معرفت حاصل ہو جاتی تو ہم محض طالب نہ ہوتے بلکہ خدا سے واصل ہو چکتے۔ اس اعتراف کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنے عقیدے کو ترک کر دیں، یا دوسرے کے عقیدے کی خامیاں محسوس نہ کریں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے عقیدے کی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہیں، ہر عقیدے کی اچھی باتوں کو اپنی زندگی کا جزو بناتے رہیں، اور سب مذاہب کا یکساں احترام

کرتے رہیں کیونکہ سب ناقص ہیں اور اس لیے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے۔ یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں قدیم سے موجود ہے۔ مگر حال میں اسے ہندوستان کے ایک بہت بڑے سیاسی و مذہبی لیڈر کی تائید حاصل ہو گئی ہے، جن کے پیرو اس عقیدے کو پھیلانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

درحقیقت مذہب کے بارے میں دو قسم کے تصورات لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک تصور تو یہ ہے کہ مذہب اس نظامِ حیات کا نام ہے جو عقائد، اخلاق اور قوانین پر مشتمل ہوتا ہے اور جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کے ذریعے انسانوں کے پاس بھیجتا ہے، ان انسانوں کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی صلاحیتیں ملی ہوتی ہیں، فطرت ان کو بہت سے غیبی حقائق کا مشاہدہ کرا دیتی ہے اور ان پر اپنی ہدایات بھیجنے کا ایسا انتظام کرتی ہے جو محفوظ بھی ہوتا ہے اور یقینی بھی۔

مذہب کے بارے میں دوسرا تصور یہ ہے کہ فلسفیوں نے اپنے عقلی غور و فکر سے کائنات کے معمے اور خدا کی ذات و صفات کے سلسلے میں جو مختلف نظریات و تخیلات قائم کیے ہیں اور تارک الدنیا بزرگوں نے اپنے اشراق، کشف اور ریاضتوں سے عالمِ غیب کے متعلق جن امور کا انکشاف کیا ہے اور خدا تک پہنچنے کے جو مختلف راستے اپنائے یا تجویز کیے ہیں ان کے مجموعے کا نام مذہب ہے۔

یہ دو بالکل مختلف تصورات ہیں، اور مذہب کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے ان دونوں کو گڈ مڈ نہ کرنا چاہیے، اگر مذہب کے بارے میں پچھلا تصور صحیح ہے تو اوپر بیان کیا ہوا عقیدہ ایک حد تک درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان خدا کی خصوصی امداد کے بغیر نہ کائنات کے معمے کو یقینی اور صحیح طور پر حل کر سکتا ہے اور نہ خدا کی ذات و صفات کے بارے میں کوئی صحیح اور آخری رائے قائم کر سکتا ہے اور نہ پیدا ہونے سے پہلے کے عالم اور مرنے کے بعد کی دنیا کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہ سب امور ایسے ہیں جو انسان کے حواس اور اس کی عقل کی حدود سے پرے ہیں، انسان اس بارے میں اپنی عقل سے جو رائے بھی قائم کرے گا وہ تخمین و گمان سے زیادہ نہ ہوگی، دنیوی معاملات میں انسان جو قیاس و گمان کرتا ہے حالات و واقعات سے اس کی تائید یا تصحیح ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں بالکل اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے یا بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے قیاسات میں خطا کے امکان سے کون انکار کر سکتا ہے، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ان میں غلطی کا امکان زیادہ ہے، اشراق، کشف اور ریاضتوں کا معاملہ عقل سے بھی گیا گزرا ہے، یہاں تو عقل و نظر کی بھی گزر نہیں، یہ بزرگ کچھ خاص خیالات رکھتے ہیں، انھیں خیالات کا نقش وہ اپنے دل پر پہلے سے بٹھا لیتے ہیں اس کے بعد اپنے خیال کے مطابق مختلف قسم کی ریاضتیں کرتے ہیں، جسم کو تکلیفیں دیتے، دھیان گیان اور مراقبے کرتے ہیں، اپنے زعم کے مطابق قلب کو

صاف کرتے اور رُوح کو مانجھنے کا انتظام کرتے ہیں، پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ عالمِ غیب کی حقیقتوں کو جھانک کر دیکھ لیں، ذہن میں پہلے سے کچھ نقوش ہوتے ہیں، دھیان کرنے سے کچھ نقوش اور پیدا ہو جاتے ہیں، ریاضتوں اور مشقتوں سے بھی ان کے دل و دماغ میں کچھ عجیب سی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ کسی معاملے کے پیچھے مسلسل پڑا رہے اور اس کے لیے دماغی اور قلبی مشقتیں بھی اُٹھانی پڑیں تو اس کے دماغ پر ایک خاص قسم کا اثر چھا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ان مرتاض بزرگوں کا ہوتا ہے۔ ان کی قوتِ متخیلہ اور واہمہ ان کے سامنے رنگ برنگ کی نقوش لاتی ہے اور یہ اس کو حقیقت و معرفت سمجھ بیٹھتے ہیں، اور دوسرے لوگ ان کی ریاضتوں سے مرعوب اور قوتِ ارادی سے مسحور ہو کر ان پر ایمان لے آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان بزرگوں کی دیانت و خلوص پر کوئی حرف لائے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے انکشافات اوہام و خیالات سے زیادہ کوئی وزن نہیں رکھتے، اور اس لیے ان تخیلات کو ناقص کہنے کے بجائے بے بُنیاد کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

لیکن کیا واقعی مذہب فلسفیانہ نظریات اور انسانی اوہام و تخیلات کا نام ہے ؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس کا دائرہ اور وسیع ہونا چاہیے اور انسان نے اپنے اور دُنیا کے بارے میں اب تک جو کچھ سوچا ہے، جو جو نظریات اور جو جو نظام قایم کیے ہیں اور دُنیا کے انسان جو تخیلات و اوہام بھی رکھتے ہیں، ان سب کو مذہب میں شامل کر لینا چاہیے۔ مغرب کی لامذہبیت اور روس کی اشتراکیت کو بھی مذہب تصور کرنا چاہیے، کیونکہ کائنات کا معمہ حل کرنے کی ان میں بھی کوشش کی گئی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ مغربی مفکرین غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں اور مرنے کے بعد کسی دوسری زندگی کا وجود نہیں۔ جس طرح کہ بعض مذہب کہتے ہیں۔

مذہب کو غیر مذہب کے مقابلے میں یہ ترجیح حاصل تھی کہ وہ انسان کے اندر یقین و اذعان پیدا کرتا ہے، برخلاف اس کے فلسفیوں کے مباحث انسان کو شکوک و شبہات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا چھوڑ جاتے ہیں اور کوئی یقین پیدا نہیں کرتے، لیکن اگر مذہب کی اصل حقیقت وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے تو اس سے انسان کے شکوک کس طرح دُور ہو سکتے ہیں اور کس طرح اسے یہ یقین ہو سکتا ہے کہ وہ اصل حقیقت کو پا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مذہب کی ایک خصوصیت جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ خدائی ہدایت ہونے کی بنا پر اپنی تعمیل آپ کراتا ہے اس کے لیے کسی پولیس اور فوج کی ضرورت نہیں ہوتی، آدمی اپنے ضمیر و وجدان اور اپنے قلبی تقاضوں سے مجبور ہو کر اُس پر عمل کرتا ہے —— مذہب کے مندرجۂ بالا تصور کو ماننے کے بعد یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان مذہبی بزرگوں نے حقیقت معلوم کرنے اور خدا کی خوشنودی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اسے خدائی ہدایت کا درجہ حاصل ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس پر عمل کرنے کا داعیہ اندر سے نہیں اُبھر سکتا، اور سچ تو یہ ہے کہ

اس تصور کے ہوتے ہوئے مذہب کے سلسلے میں خدا کا نام لینا بھی غلط ہے۔ کسی کو اپنے ذاتی نظریات و تجربات کو خدا کی طرف منسوب کرنے اور اپنی غلط فہمیوں سے خدا کو بدنام کرنے کا کیا حق ہے؟

اس سلسلے میں مذاہب کے اختلاف کو درخت کی شاخوں اور پتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے حالانکہ اگر درخت ہی کی مثال پر غور کر لیا جائے تو اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، ایک درخت کے بیج، اس کی جڑ، اس کے تنے، اس کی شاخوں، اس کے پتوں اور پھلوں پھولوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، ان میں آپس میں گہری مناسبت ہوتی ہے، وہ سب مل کر ایک جسم بناتے ہیں اور ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ آم کے بیج سے املی کا تنہ پیدا ہو جائے جَو بو کر گیہوں کی فصل کاٹنے کو مل جائے اور ببول میں گلاب کے پھول پتے لگیں، لیکن کیا مذاہب کے اختلاف کی نوعیت بھی یہی ہے، کیا توحید اور شرک میں کوئی مناسبت ہے کیا ترکِ دُنیا اور خلافتِ ارضی کے نظریوں میں کوئی اشتراک ہے، اگر نہیں تو پھر ان کو اور ان جیسے دوسرے متضاد نظریوں کو برحق کیسے کہا جائے اور ان کے اختیار کرنے کی کس طرح تلقین کی جائے۔ عملی زندگی میں اس کے نتائج اور بھی شدید صورت اختیار کر لیتے ہیں، کیا یہ کوئی صحیح رویہ ہے کہ نوعِ انسانی کو ایسے راستوں پر چلنے کے لیے کہا جائے جن پر چل کر انسانوں میں انتشار، تضاد اور تصادم کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ دُنیا میں اس وقت انتشارِ فکر کی کوئی کمی نہیں ہے کہ اسے اور بڑھایا جائے۔

آج کی دُنیا مذہب کی طرف اس لیے نہیں تک رہی ہے کہ اسے پچھلے بزرگوں کے کچھ معتقدات یا ایسی جنتر منتر پر ایمان لانا ہے۔ بلکہ وہ انسانی افکار و نظریات سے مایوس ہو کر مذہب کی طرف رجوع کر رہی ہے اور اس لیے رجوع کر رہی ہے کہ اسے کوئی ایسا نظامِ زندگی ملے جو اس کی گتھیاں سلجھائے، اس لیے بجائے اس کے پچھلے فلسفیوں کے تمام افکار کو یکساں سراہا جائے، وہ افکار پیش کیے جائیں جو مسائل زندگی کو حل کرنے میں مدد و معاون ہوں، دُنیا انھیں ذوق و شوق کے ساتھ اپنائے گی۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ان افکار کا پیش کرنا اور لوگوں کے ذہن کو منتشر کرنا نہ مفید ہے نہ دُنیا کے لیے اس میں کوئی کشش ہے، رہے تارک الدنیا بزرگ تو ان سے یہ معلوم کرنا کہ زندگی کے ہنگاموں میں امن و سکون کیونکر پیدا کیا جائے اور سیاست و تمدن، معاشرت و معیشت اور اخلاق و معاملات میں پڑنے والی اُلجھنوں کو کس طرح حل کیا جائے، ان پر بھی ظلم ہے اور اپنے اوپر بھی، تارک الدُّنیا لوگ دُنیا کے ہنگاموں کو کیا جانیں اور انھیں حل کرنے کی تدابیر کیا بتائیں، ان کے نزدیک اگر انسان کی نجات و بہبود دُنیوی معاملات میں مشغول رہنے سے ہوتی تو وہ زندگی کے ہنگاموں سے فرار کی راہ کیوں اختیار کرتے۔ ان سے تو یہ پوچھیے کہ ترکِ دُنیا کے طریقے کیا ہوتے ہیں۔

لیکن اگر مذہب کے بارے میں آخری تصور غلط ہے اور پہلا تصور صحیح ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے

مخصوص بندوں کے ذریعے اپنی ہدایت خود نازل فرمائی ہے تنہا اُس خیال کے صحیح ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت میں نہ خطا کا امکان ہے، نہ وہ ناقص ہوتی ہے، نہ اُس میں تضاد ہوتا ہے اور نہ اُس میں باہر سے کچھ اجزا کے شامل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی تصور کے ماتحت مذہب خدا کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، علم و یقین بخش سکتا ہے، انسان کے اندر اُس پر عمل کرنے کے لیے قلبی داعیہ پیدا ہو سکتا ہے اور سب سے آخری بات یہ کہ اسی صورت میں وہ انسانی مسائل کو تسلی بخش طریقے پر حل کر سکتا ہے کیونکہ اس کا مصنف وہ خدا ہے جو ساری حقیقتوں سے واقف اور تمام حالات سے باخبر ہے۔

اختلافِ مذاہب سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ صرف ایک مذہب صحیح ہے اور باقی تمام مذاہب غلط اور بے بنیاد ہیں، اس کے بعد وہ کسی خاص مذہب کی حمایت اور دوسرے تمام مذاہب کی تردید شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں غور طلب امر یہ ہے کہ جس مذہب کو وہ برحق سمجھتے ہیں وہ کب وجود میں آیا ہے، نوعِ انسانی کے زمین پر آباد ہونے کے ساتھ ساتھ، یا درمیان کے کسی زمانے میں، اگر کسی درمیانی زمانے میں وہ مذہب پیدا ہوا ہے تو سوال یہ ہے کہ اُس زمانے سے پہلے کے انسانوں کو اُس سے کیوں محروم رکھا گیا، کیا انھیں اس مذہبِ برحق کی ضرورت نہ تھی، وہ جس طریقۂ زندگی کو اختیار کیے ہوئے تھے وہ اس مذہبِ برحق سے جُدا ہونے کی بنا پر یقیناً غلط ہوگا پھر ان کی ہدایت کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا؟

اور اگر اس مذہب کے بارے میں خیال یہ ہے کہ وہ ابتدائے آفرینش ہی سے وجود میں آیا ہے تو اول تو یہ بات ثابت کرنی ہوگی، دوسرے یہ بتانا ہوگا کہ وہ ہم تک کس طرح منتقل ہوا، اگر وہ محفوظ نہیں رہا ہے تو ہمارے لیے بے کار ہے اور اگر وہ محفوظ رہا ہے تو اُس کے محفوظ رہنے کی شکل کیا تھی۔ پھر یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اتنے قدیم زمانے کا مذہب ہمارے آج کل کے مسائل حل بھی کرتا ہے یا نہیں، اگر وہ ابتدائے آفرینش سے پایا جاتا ہو، محفوظ صورت میں ہم تک پہنچا ہو، اور ہمارے آج کے مسائل حل کرتا ہو تو ہمیں اُس کے اختیار کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہونا چاہیے لیکن جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے، ایسا کوئی مذہب دُنیا میں موجود نہیں ہے +

ضروری اطلاع

محمد عبدالحی طابع و ناشر نے مرتضیٰ برقی پریس میں چھپوا کر دفترِ رسالۂ زندگی رام پور (یو۔پی) سے شائع کیا۔